استدلال، حالی کی سی سادگی و روانی اور شاہ اسماعیل کی سی گرمی گفتار بھی تھی اور خود ان کی اپنی شگفتگی، عالمانہ وقار اور بالغ نظری جسے عربیت کے ذوق نے جوامع الکلم کی خصوصیات بھی دے دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ادب حالی کی نسبت شبلی سے زیادہ متاثر ہوا ہے، اور ہمارے ادب کے مؤرخوں نے شبلی کی "مذہبیت" کے باوجود انھیں ادبی حیثیت سے بھی ایک بلند مقام دیا ہے، گویا وہ پہلے مولوی ہیں جنھیں "ادیب" بھی تسلیم کیا گیا۔ ان سے ذرا پہلے ڈاکٹر نذیر احمد بھی مولوی تھے، لیکن ادب میں ان کی مولویت دبی ہوئی ہے اور دینی موضوعات میں سے ایک آدھ ہی پر انھوں نے کچھ کام کیا ہے اور وہ بھی اتنا معروف و مقبول نہیں ہوا۔ بہرصورت ادب میں دین و دنیا کی جو تفریق اوپر سے مسلم چلی آ رہی تھی، اسے پہلے شاہ شہید نے مٹانے کا کام کیا، لیکن اس کی تکمیل شبلی کے ہاتھوں ہوئی۔

شبلی کی تصانیف و موضوعات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ چند سطور میں اس کا اجمالی ذکر بھی مشکل ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی بدولت اردو ادب میں بالفاظ اقبال "عجم کا حسن طبیعت" اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ اور ان کی تصانیف نے ہمارے اندر مسلم ملت ہونے کا واضح شعور اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑ کر پیدا کیا۔

**چھٹی کڑی، علامہ محمد اقبال**: یوں تو اقبال کو ہمارے علما، ادبا، شعرا سے لے کر عوام کے ایک ایک فرد تک اپنا ملی شاعر مان کر اس پر فخر کرتے ہیں، لیکن ان کی توصیف و تحسین کا بیشتر حصہ جذباتی اور بے مصرف ہوتا ہے۔ بہت کم حضرات نے سنجیدگی سے اقبال کے حقیقی کارنامے اور ملت پر اس کے احسان کا جائزہ لیا ہے، اور اس طرف تو بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے کہ اقبال کے افکار و تخیل کی تشکیل میں اردو ادب کے گذشتہ ارتقائی مراحل کا اصل حصہ ہے۔ لوگوں نے اقبال کا ذہنی رشتہ نیٹشے، رومی، برگسان وغیرہ سے جوڑنے میں تو خاصی محنت سے کام لیا، لیکن اس پر غور نہ کیا کہ خود اردو ادب میں ان سے پہلے گزرنے والے اساطین نے ان کے لیے کیا ترکہ چھوڑا، جسے انھوں نے مزید ترقی اور جلا بخشی۔ درحقیقت اقبال کو اپنے ان ادبی اسلاف--- حالی، شبلی اور سرسید سے جو کچھ ملا اسی پر انھوں نے اپنی شاعری اور فکر کی عمارت اٹھائی۔ بیرونی مفکرین نے تو محض اس عمارت کو تقویت دینے کا مسالہ ہی مہیا کیا۔

اقبال تک پہنچتے پہنچتے، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اردو ادب نے برصغیر کے مسلمانوں کو عقل، فکر، علم اور ملی احساس کی نعمتیں عطا کر دی تھیں۔ اب ادب ذہنی عیاشی یا تقلیدی عقائد کو مستحکم کرنے والی چیز نہیں رہ گیا تھا۔ مسلم ملت کو اپنی زبوں حالی اور زیاں کاری کا اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہو چلے تھے کہ برصغیر میں صدیاں بسر کر چکنے کے باوجود ان کا قلبی و ذہنی تعلق اسلام کے سرچشمے سرزمین حجاز سے ہونے کے باعث وہ آج بھی اس ملک میں اجنبی ہیں، اور انھیں اپنا تشخص اتنا عزیز ہے کہ وہ

دوسری (نسلی) قومیتوں کی طرح اس کان نمک میں نمک بن جانے پر آمادہ نہیں۔ اب وہ غیر شعوری طور پر اس بات کے طالب تھے کہ انھیں کوئی ایسی تدبیر بھائی جائے جس سے وہ الگ تشخص رکھتے ہوئے اپنا وجود منوا سکیں اور اس پر فخر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب مسلمان اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھ سکیں' اور یہ جان لیں کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح محض ایک نسلی' تہذیبی یا جغرافیائی نسبت سے ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی ملت ہیں اور اس اعتبار سے ان کی انفرادیت تبھی برقرار رہ سکتی ہے جب وہ ان تنگ حد بندیوں (نسل' رنگ وغیرہ) سے آزاد ہو کر اپنا بین الاقوامی بلکہ بین الانسانی ہونا اچھی طرح معلوم کرلیں' بالفاظ دیگر' اپنی خودی پہچان لیں۔

یہ تسلسل افکار کا ایک منطقی نتیجہ تھا جسے اب تک کوئی ادیب یا مفکر شعوری طور پر نہ سمجھ پایا تھا' کیونکہ اس کے لیے پچھلی صدی تک حالات سازگار نہ تھے۔ البتہ بیسویں صدی آنے کے بعد اردو ادب کا فکری سفر اس منزل تک جاری رکھنے کے لیے ایک ذہین' فلسفی اور صاحبِ دل مزاج شناس ملت کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت اقبال نے پوری کر دی۔ ان کے ابتدائی کلام سے اخیر تک کی شاعری میں ان کے ارتقاے تفکر کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کو محض نام کا مسلمان سمجھنے کے بجائے "حقائق ابدی کی اساس" یاد دلانا اور وقت کے تازہ خدا "قومیت" یا "وطنیت" کی پرستش سے باز رکھنے کی کوشش کرنا' اور اس کے بجائے "حرم کی پاسبانی" پر اکسانا' اقبال نے پورے دانشورانہ اور فلسفیانہ سلسلہ استدلال کے ذریعے حق سمجھ کر اپنا مشن بنایا۔ ان کی بدولت ادب میں خیالات کی جو نئی انقلابی رو داخل ہوئی وہ صحیح معنوں میں سرسید تحریک کو نیا موڑ دکھانے والی ثابت ہوئی۔ اقبال کے کارنامے کو مختصراً اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے کہ:

(۱) اقبال نے تنگ قومیت سے نکل کر مسلمانوں کو بین الاسلامی ملت کا جز ہونے کا احساس دلایا۔

(۲) تصوف اور غلامی (اپنے بادشاہوں' اکابر یا غیر ملکی آقاؤں سب کی غلامی) نے جمود اور منفی اخلاقیات میں مسلمانوں کو جکڑ رکھا تھا' اقبال نے اس سے نجات پانے کا راستہ خود شناسی کے ذریعے سکھایا۔

(۳) مخالفت سے مزاحم ہونا اور شر سے ٹکرا کر ختم ہو جانے کے بجائے ردعمل کے طور پر خیر کی طرف بڑھنے کی دعوت دی۔ گویا وسعت پذیری' خود اعتمادی اور ردعمل--- یہ وہ اہم ترین رجحانات تھے جو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ملت کو سکھائے اور اس پر مستزاد' روشن مستقبل پر یقین کامل کا تحفہ بھی عطا کیا' جو اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ یہ محض نعرہ بازی یا کھوکھلی جذباتیت کی پیداوار نہیں' ایک فطری اور منطقی نتیجہ تھا' اس تسلسل افکار کا جو اقبال پیش کر رہے تھے اور اسی لیے اقبال کو مستقبل کا شاعر بھی کہا گیا ہے۔

میں نے نہایت سرسری اور اجمالی خاکہ اردو ادب کا گذشتہ اوراق میں پیش کیا ہے' اور اگر حالات نے

اجازت دی یا اس پر اہل علم نے بحث کا دروازہ کھولا تو اس کی تفصیلات میں بھی جایا جا سکتا ہے۔ البتہ ہمارے ادب کی تاریخ جس طرح میرے نزدیک وقفے وقفے کے بعد اہم تر موڑ مڑتی آ رہی ہے اس نہج پر آج تک ہمارے مورخین ادب نے اسے مدون و مرتب نہ کر کے ادب کے طالب علموں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ تاریخ صرف واقعات کی کھتونی نہیں ہوتی، وہ ایک محافظ خانہ، ایک رجحان پیما اور ایک آیندہ کا مشیر (indicator) بھی ہوتی ہے، جس کے مطالعے سے واضح طور پر اپنا ماضی مربوط اور مسلسل صورت میں جان کر ہم اپنے مستقبل کی بھی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ کاش اردو ادب کی تاریخ بھی اس نہج پر مرتب کی گئی ہوتی۔ آج ہم مولانا مودودیؒ جیسے ادیب کو تاریخ ادب میں نمایاں، بلکہ انقلابی مقام دینے کی جسارت کر رہے ہیں، تو ہمیں خود احساس ہے کہ مورخین و نقادان ادب کی محفل سے خود کو بالکل الگ تھلگ اور تنہا پا رہے ہیں اور گویا بظاہر یہ ایک "اوپری اوپری" سی بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اگر دوسری زبانوں کی طرح اردو کی تاریخ بھی افکار و تخیلات کی صحیح، سائنسی شعبہ بندی کے مطابق کی جاتی تو یہ اوپرے پن کا احساس نہ ہوتا۔

**آخری کڑی، سید ابوالاعلیٰ مودودی**: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق آج دنیاے اسلام کا بچہ بچہ اور بقیہ دنیا کا بھی بیشتر حصہ واقف ہے کہ وہ ایک تاریخ ساز ہستی تھے۔ ان کے افکار، ان کا قوی ایمان، ان کی بے نظیر تربیت و تزکیہ نفس، ان کی تنظیمی صلاحیت، غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو صدیوں میں خوش قسمتی ہی سے کسی قوم کے حصے میں آجاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہاں ان کی تمام دوسری وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں سے قطع نظر کر کے صرف ان کی ادبی حیثیت متعین کرنی ہے۔

اوپر ہم پڑھ چکے ہیں کہ اقبال نے ادب کو "اسلامیت" کا تخیل دیا جو ان سے پہلے "مسلم قومیت" سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے اہم مگر نازک فرق کو عوام تک پہنچانے اور واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ مسلم قومیت کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اسلامیت کے بالکل دوسرے۔ لیکن یہ کام نہ تو اقبال نے کیا، نہ یہ ان کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک تصور کی اصلاح کر رہے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے شعر کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ استعارے کی زبان میں، انھوں نے پٹڑی سے اتری ہوئی ٹرین کو پٹڑی پر رکھنے کا کام کیا تھا، جو ایک کرین کرتی ہے۔ اس کرین سے ریلوے انجن کا کام کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ وہ گاڑی کو صحیح سمت میں لے بھی چلے۔ اس کے لیے قدرت الٰہی نے ایک نثرنگار کو پیدا کیا۔ کیونکہ جو چیز نظم میں مجمل اور محدود ہوتی ہے وہی نثر میں مفصل اور لامحدود طور پر ادا کی جا سکتی ہے۔

اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے ملت کو جو شعور ذات بخشا تھا وہ اپنی جگہ تھا تو بالکل صحیح، مگر اس کی تفصیلات پر، انھوں نے کچھ نہ کہا۔ وہ اگر کہنے کے اہل بھی ہوتے تو نہ کہہ سکتے تھے۔ اول تو نظم کا یہ کام ہی